R. No. 2166/57

Regd. No. L. 922.

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

ٹیلی فون - ۲۹
قیمت فی پرچہ:
پندرہ پیسے

جلد ۲۵ - شمارہ ۸	ایڈیٹر: آل احمد سرور	۲۲ فروری ۱۹۶۶ء

اداریہ

ایسی بلندی ایسی پستی

ٹائمس لٹریری سپلی منٹ کے حال کے ایک اداریے میں انگلستان میں نئی کتابوں کی اشاعت پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ لوگ اب کلچر کے کم اور کاروبار کے زیادہ قائل ہوتے جاتے ہیں چنانچہ فنی کتابوں اور درسی کتابوں کی تعداد بڑھی ہے مگر نئے ناول کم شائع ہوئے ہیں، سوانح عمریاں کم نکلی ہیں اور شاعری اور ڈراما پر کتابوں کی تعداد میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ ہاں ادبی تاریخ، تنقید، انشائیہ اور فنون لطیفہ پر کتابوں میں اضافہ ہو رہا ہے اور اس کا تعلق بھی درسیات سے ہے۔ سائنسی مضامین پر کتابوں کی تعداد بڑھی ہے، لیکن کتب فروشوں کی تعداد کم ہوئی ہے۔ قومی اخراجات میں کتابوں، اخباروں اور رسالوں پر خرچ کم ہوا ہے۔ پیپر بیک یعنی سستے کاغذ پر دفتی کی جلد کی مقبولیت بدستور ہے۔

ان معلومات سے ہم بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی سماج کی ذہنی صحت کے لیے کاروباری اغراض سے بلند ہو کر کلچر کے فروغ کے لیے اچھی کتابوں کی ضرورت ہے۔ اچھی کتابوں سے وہ علمی و ادبی کتابیں یہاں مراد ہیں جو درسیات کے لیے نہیں عام پڑھنے والوں کے لیے ہیں۔ ظاہر ہے کہ خاص موضوعات پر علوم و فنون میں مہارت حاصل کرنے والوں کا یہاں سوال نہیں ہے۔ عام پڑھنے والوں کی تعداد ہمارے یہاں بڑھی ضرور ہے مگر جس قسم کی کتابیں یہ لوگ پڑھتے ہیں وہ اچھی اور معیاری کم ہوتی ہیں، سستی، سنسنی خیز اور تفریحی زیادہ۔ اگر علوم پر عام فہم کتابوں کی تعداد اور اچھے ناولوں، افسانوں، شاعری، سوانح اور ڈراموں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہو تو یہ اچھا شگون ہوگا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ معیاری ادب پڑھنے والوں کا دائرہ گھٹتا جاتا ہے اور سستے ادب کے پجاریوں کا حلقہ بڑھتا جاتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ سستے ادب کے پجاریوں کی تعداد موجودہ صنعتی دور میں بڑھے گی، مگر تہذیب، سماج اور ادب کی رفتار پر نظر رکھنے والوں کو سوچنا چاہیے کہ اگر معیاری ادب کی اشاعت اور مقبولیت محدود ہو گئی تو سماج کا کیا ہوگا۔ اس وقت تنقید اور تحقیق کی کتابوں کی جو مانگ ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اردو ادب کی تعلیم اعلیٰ درجے تک پہلے سے زیادہ ہے اور اس کی وجہ سے تحقیق و تنقید کا سلسلہ بھی بڑھا ہے، مگر اس کے خریدار اساتذہ اور طلبا یا کتب خانے زیادہ ہیں، عام پڑھنے والے اتنے نہیں۔ آج بھی ہمارے یہاں کسی شاعر کا پہلا مجموعۂ کلام، کسی ناول نگار کا پہلا ناول، کسی افسانہ نگار کے افسانوں کا پہلا مجموعہ مشکل سے بک پاتا ہے۔ لکھنؤ کے ایک کتب فروش نے بتایا کہ "آزادی کے بعد سے اچھی انگریزی کتابوں کے پڑھنے والے بھی کم ہو گئے ہیں۔ ہندی کو ادھر بڑا فروغ ہوا ہے، مگر ہندی کی معیاری کتابیں بھی عام پڑھنے والے کم خریدتے ہیں، حکومتیں اور کتب خانے زیادہ۔" اس لیے ہمارا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اچھے اور معیاری ادب کے پڑھنے والوں کی تعداد بڑھے۔ یہ تعداد اسی وقت بڑھ سکتی ہے جب ابتدائی منزل میں اردو پڑھنے والے، ثانوی منزل میں اردو پڑھنے والے اور پھر اس سے آگے اعلیٰ تعلیم کی منزل پر اردو پڑھنے والے بڑھیں۔ یہاں پڑھانے والے اس طرح انھیں اردو پڑھائیں کہ خواہ بعد میں وہ کوئی کام کریں، ان میں ادب کی قدر و قیمت کا احساس اور ادب سے لگاؤ پیدا ہو۔ ان کی درسی کتابیں ایسی ہوں جن میں ادب کا ایک تسلی بخش معیار بھی ہو اور مجموعی طور پر ان سے ادب سے محبت اور زندگی میں ادب کی اہمیت کا احساس پیدا ہو۔ افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہو رہا ہے۔ اس کی

اس شمارے میں

ذمے داری تو پورے سماج پر ہے، اگر حکومت پر زیادہ ہے جس نے اردو کی تعلیم کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کر رکھی ہیں۔ مگر اردو دوست بھی اپنے فرض کو پہچانیں اور یہ سمجھ لیں کہ اردو کی بنیاد نہ ہونے کی وجہ سے ایک خاص عمر میں ادب سے آشنا نہ ہونے کی وجہ سے اور اس طرح چند اعلیٰ قدروں سے محروم ہو جانے کی وجہ سے ان کی آئندہ نسلیں نہ صرف ان کے تہذیبی سرمائے کی امین نہ بن سکیں گی، بلکہ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ہوا جدھرے جائے گی ادھر چلی جائیں گی۔ بلاشبہ آزادی کے بعد اردو ادب کی قدر بڑھی ہے۔ مگر زبان کی تعلیم تسلی بخش پیمانے پر نہ ہونے کی وجہ سے اس ادب کا دائرہ سکڑتا جا رہا ہے۔ اچھے اور معیاری رسالوں کی اشاعت ہمارے یہاں کتنی ہے، اچھی کتابوں کے کتنے اڈیشن نکلتے ہیں اور کتنے سالوں میں ایک اڈیشن ختم ہوتا ہے۔ جو لوگ صرف لکھنے کو اپنی زندگی بنانا چاہتے ہیں وہ کیا معقول آمدنی کے مالک ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ہمارا فرض یہ ہے کہ ابتدائی منزل پر اردو کی تعلیم کا ایسا انتظام کریں اور کرائیں کہ ہر بچہ جس کی مادری زبان اردو ہے اردو کے ذریعہ سے تعلیم حاصل کر سکے پھر اس کی کوشش کریں کہ سائنس اور کامرس لینے والے طالب علم بھی اردو ادب کی اتنی بنیاد رکھتے ہوں کہ وہ ادب کی قدروں کے احساس کے ذریعہ سے تہذیب اور سماج کی ترقی میں حصہ لے سکیں۔

دلی میں اردو کی ترقی و ترویج کیلئے ایک لاکھ روپیہ منظور

دلی ۲۰ر فروری جن سنگھ کی زبردست مخالفت کے باوجود آج کارپوریشن کے بجٹ اجلاس میں اردو کے فروغ کے لیے ایک لاکھ روپے کی امداد کی تجویز زبردست اکثریت سے منظور کر لی گئی۔ یہ تجویز جو بجٹ میں ترمیم کے طور پر پیش کی گئی تھی چودھری عبدالستار نے پیش کی اور اس کی تائید حکیم محمد شریف خاں صاحب نے کی۔ (الجمعیۃ)

وحید اختر کا مجموعۂ کلام "پتھروں کا مغنی"

مارچ کے وسط تک شایع ہو جائے گا

علی گڑھ ۲۰ر فروری۔ اردو کے مشہور شاعر ڈاکٹر وحید اختر کا مجموعۂ کلام "پتھروں کا مغنی" طباعت کی آخری مراحل میں ہے اور امید ہے کہ مارچ کے وسط تک منظر عام پر آ جائے گا۔ اس مجموعہ میں وحید اختر صاحب کی منتخب اور نمایندہ نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ (نامہ نگار)

ہندستان اور پاکستان کے ۲۷۷ شعرا کی پنجابی غزلوں کا مجموعہ

نئی دلی۔ ۱۵ر فروری۔ پنجابی شاعر مسٹر جانن گوبند پوری کی طرف سے پنجابی کی منتخب غزلوں کا ایک مجموعہ چھاپا جا رہا ہے۔ یہ غزلیں ۱۸۷۶ء سے ۱۹۷۵ء تک کے عرصہ میں لکھی گئی ہیں۔

مسٹر گوبند پوری نے خود ہی اس کتاب کی ترتیب و تدوین کی ہے جس میں ہندوستان اور پاکستان کے ۲۷۷ شعرا کی منتخب غزلیں درج ہیں اس کے علاوہ اس میں غزل کے موضوع پر ایک تبصرہ بھی شامل ہے۔ پنجابی میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ (قومی آواز)

انجمن ترقی اردو کی جانب سے شبینہ اردو

کاشی (ڈاک سے)۔ کاشی کی انجمن اردو کی جانب سے بالغوں کو شب میں اردو پڑھانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ ان مدارس میں شب میں ساڑھے آٹھ بجے سے کلاسیں لگیں گی۔

فی الحال ۱۵ر فروری سے حسین آباد کاشی میں پہلی کلاس کھول دی گئی ہے۔ حسین آباد کے لوگوں کو چاہیے کہ وہ ممتاز حسین حیدری صاحب انچارج شبینہ مدرسہ انجمن ترقی اردو سے رابطہ قائم کریں۔ دوسرے علاقے کے وہ لوگ جو اردو سیکھنا چاہتے ہیں وہ انجمن کو باقاعدہ درخواست دیں ان کی سہولت کے مطابق انتظام کر دیا جائے گا۔

کاشی کے اردو دوستوں سے مودبانہ درخواست ہے کہ وہ انجمن کے ساتھ تعاون فرما کر اپنی روایتی اردو دوستی کا ثبوت دیں۔ (الجمعیۃ)

بچوں کیلئے نیا میگزین "اسپتنک"

نئی دلی (فروری) ہندوستان میں سوویت سفارت خانے کے محکمۂ اطلاعات نے نئے سال کے موقع پر بچوں کے لیے ایک نئے ماہنامے "اسپتنک" کا اجرا کیا ہے۔ اس کا پہلا شمارہ نوعمر قارئین کو سوویت بچوں کی زندگی، ان کی دلچسپیوں، ان کی پڑھائی اور تفریح سے متعارف کراتا ہے۔ یہ نیا رسالہ ایک ساتھ ہندی اور انگریزی میں شایع ہوگا۔ اس میں رنگین تصویروں کے ساتھ کہانیاں اور ڈرامے شایع ہوں گے۔ اس کے علاوہ یہ ہندستانی بچوں کو نئے نئے کھیل سکھائے گا، تصویریں بنانے اور کھلونے تیار کرنے میں ان کی مدد کرے گا۔

جشن فراق گورکھپوری

زیر اہتمام بزم شعر و نغمہ بمبئی اردو کے بلند پایہ شاعر و ناقد حضرت فراق گورکھپوری کا جشن ۲۶ و ۲۸ راپریل ۱۹۷۶ء کو رنگ بھون میں منایا جا رہا ہے۔ ۲۷ راپریل کو فلمی دنیا کے چوٹی کے گلوکار مشہور اداکار جناب دلیپ کمار کی صدارت میں فراق صاحب کا کلام پیش کریں گے۔ ۲۸ راپریل کو ایک آل انڈیا مشاعرہ ہوگا۔ (مظفر شاہجہانپوری سکریٹری)

امیر عارفی کو مجاز طلائی تمغہ

علی گڑھ ۲۰ر فروری۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق طالب علم اور اردو کے مشہور شاعر جناب اسرار الحق مجاز مرحوم کے نام سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ہر سال مجاز طلائی تمغہ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ تمغہ ہر سال یونیورسٹی کے ایک طالب علم شاعر کو دیا جایا کرے گا جس کی تخلیقات کو یونیورسٹی کا مقرر کردہ ادیبوں کا بورڈ سال کی بہترین تخلیقات قرار دے گا۔ ۷۶-۱۹۷۵ء کے مجاز طلائی تمغہ کے لیے ایم اے سال آخر (اردو) کے طالب علم امیر عارفی کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ان کو یہ تمغہ جلسۂ تقسیم اسناد میں دیا جائے گا۔ (نامہ نگار)

ڈاکٹر محمد عقیل

اردو میں ہمزہ کا استعمال

علی گڑھ کے اردو تعلیمی سیمینار منعقدہ ۳۰ر دسمبر تا ۲ر جنوری ۷۵ء میں یہ مسئلہ زیرِ بحث آیا کہ اردو میں ہمزہ کا استعمال بے معنی اور فضول ہوتا ہے۔ روایتی لکھنے والے اپنی پرانی عادت کے مطابق اس حرف کو لکھتے چلے جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی کہی گئی کہ ہمزہ کا کام صرف کسرہ یا "ی" سے لیا جا سکتا ہے لیکن روایتی طور پر لکھنے والے ایک طرف ہمزہ کا استعمال کرتے ہیں اور دوسری طرف "ی" میں نقطے بھی لگاتے ہیں۔ اس بات کی تحریک ان چند ہوشیار اور لسانیات سے واقفیت رکھنے والے مدوّنین نے کی جو حال ہی میں امریکہ سے صوتیات (Phonology) کی ٹریننگ لے کر آئے ہیں۔ اپنی بحث میں انھوں نے جملوں اور آوازوں کی ساخت کے متعلق بہت سے نادر موتی بھی بیان کیے اور زبان کو سائنٹفک ڈھنگ سے پڑھانے کا مطالبہ بھی کیا۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سی باتیں اردو والوں کے لیے بالکل نئی ہیں اور کارآمد بھی۔ صوتی آہنگ، زیر و بم، لفظوں کے اتار چڑھاؤ سے عبارت میں جو ایک حسن پیدا ہو جاتا ہے ان سب باریکیوں اور خوبیوں سے باخبر معلم، طریقۂ تعلیم کو نہ صرف کارآمد بلکہ اور دلچسپ بنا سکتا ہے لیکن اردو طرزِ تحریر سے ہمزہ کو الگ کر دینے سے اور بہت سی صوتی، تحریری اور تخرج کی الجھنیں پیدا ہو جائیں گی۔ ان دانشوروں نے ان کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی۔

یہ درست ہے کہ اردو کے حروفِ تہجی کا نظام صوتی ترتیب پر قائم نہیں ہے اور اگر اسے صوتی ترتیب پر کسی طرح لے آیا جائے تو مبتدیوں کے لیے شاید کچھ تعلیمی آسانیاں بھی نکل آئیں لیکن ہمزہ کو نکال دینے پر بعض لفظوں کو صحیح طور پر لکھنا اور انھیں آوازوں کے ساتھ، جو کہ ان کے تلفظ کی صحیح آوازیں ہیں، پڑھنا تقریباً ناممکن ہو جائے گا اور خاص طور پر شعر میں ایسے الفاظ نظم کرتے وقت صوتی آہنگ اور وزن کے قیام دونوں میں سخت مشکل پیش آئے گی۔ عربی زبان میں ہمزہ کا استعمال جس طرح ہوتا ہے اس کا بدل تو ممکن ہی نہیں لیکن اردو میں بھی یہ وقت تقریباً اسی طرح کی ہوگی۔

عربی میں ہمزہ کی واضح صورتوں کا استعمال دو طریقوں پر ہوتا ہے۔ پہلا طریقہ بندشی (PLOSIVE CONSONANT) کا ہے اور دوسرا حلق بندی آوازوں (GLOTTAL STOP) کا۔[1] لیکن اردو میں ہمزہ کا کام مصوتہ کا ہے جو کبھی اکیلے اور کبھی جڑواں مصوتہ (DIPTHONGIC) استعمال ہوتا ہے۔ ہمزۂ القاطع کا استعمال اسی لیے تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے کیونکہ ایسی صورتوں میں اسے بالکل عربی شکل و آواز اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اکثر پرانی اردو میں ایسے نمونے بھی ملتے ہیں جب ہمزۂ القاطع اضافت کے لیے بھی لکھا جاتا جیسے خلفائے اسلام کے بجائے "خلفاءِ اسلام" بھی لکھ دیا جاتا۔ ہمزہ کے اس کثرتِ استعمال نے اردو کی رسمِ تحریر میں اختصار اور ایک خاص صوتی آہنگ پیدا کر دیا ہے جو نہ عربی میں ہے اور نہ اسے چھوڑ کر اردو والے اپنی عبارت میں وہ صوتی حسن پیدا کر سکیں گے۔ اور بعض لفظوں نے تو ایسی مرکب صورتیں اختیار کر لی ہیں کہ ہمزہ سے دست بردار ہو کر ہم ان الفاظ سے ہی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ یہ صورت اگر کسی بہتر تبدیلی کے لیے ہوتی تو چنداں مضائقہ نہ تھا کیونکہ الفاظ صوتیاتی اور لسانی تاریخ کے طویل و عریض سفر میں برابر بنتے مٹتے رہتے ہیں لیکن اپنا بہتر بدل لا کر زبان کے مزاج اور چلن کو وہ صورت اختیار کر لینے پر مجبور کرتے ہیں جس میں سہل انگاری کے ساتھ ساتھ عرضِ صرف اور خوبیٔ آواز بھی شامل ہوتی ہے۔ لیکن جدید صورتیں جو ہمزہ کے بغیر تجویز کی جا رہی ہیں وہ شاید الفاظ اور زبان کے ان تاریخی جنے پہچانے راستوں پر گامزن نہیں ہوتیں جن سے لسانی اور صوتی تغیرات مانوس ہیں۔

جو لوگ ہمزہ کے استعمال کے حق میں نہیں ان کا کہنا ہے کہ ہم عملی طور پر ہمزہ کے بغیر کام چلا سکتے ہیں۔ الفاظ کو آواز کی حرکت اور سلیبل (SYLLABLES) کے نقاطِ قاطع سے الگ کر کے تحریری شکلوں میں لا کر مثال کے طور پر "مسئلہ" کو "مس الا" یا "مس لہ" لکھیں گے اور سیاق و سباق سے صحیح پڑھ لیں گے (کیونکہ اسے MISSALLAH پڑھ لینے کے بھی امکانات ہیں) ہم سمجھتے ہیں کہ ہمزہ کے استعمال کے بغیر لکھنؤ، "سوئیکٹی"، "سپئے"، "بیئے پور" (سینی پور، ضلع اناؤ کا پرانا نام)، عجائب، امرأ القیس، اناؤ، کھڑکائے، بہرائچ، خانۂ خدا (خانہ خدا کہاں ہے)، ہیئت، زائران حرم، لاؤ (اس میں واؤ کی خفیف آواز کا اظہار)، آؤ (اس میں واؤ کی الگ دو ٹکڑوں کی آواز کا اظہار)، آئینہ (دو آوازوں کے ساتھ)، منارۂ عظمت اور اسی طرح کے بہت سے الفاظ بغیر اپنی ہمزہ کی ترکیبوں کے نہیں لکھے جا سکتے۔ اس طرح کہ ان کی وہی صورت و آہنگ باقی رہے لیکن جو لوگ ہمزہ کے استعمال کے منکر ہیں وہ ایسے تمام الفاظ کو حسبِ ذیل طریقوں پر لکھنے کو تیار ہیں۔ نئے طرزِ تحریر میں (ہمزہ کے بغیر) متذکرہ بالا الفاظ اس طرح لکھے جائیں گے:

لکھنؤ (۱) لکھ ناو (۲) لکھنَ اُو

مئو (۱) ماؤ (۲) مَ اُو (پہلا طریقہ قدیم اردو میں رائج تھا بعد کو متروک ہو گیا)

---

[1] The Phonetics of Arabic by W. H. T. GAINDER P. 30–31, 1925 edition

[2] انھیں اعراب بالحروف کہتے تھے جیسے پکارنا میں پ کے پیش کو "و" سے ظاہر کرنا (کربل کتھا مثلاً) لاگی گی یہاں زبر کو الف سے ظاہر (باقی صفحہ ۱۲ پر)

کیکئی = (۱) کے کئی (۲) کے کئ ای

پئے = (۱) پہ اُے (۲) پ ۔ اے

پئے پور = (۱) پیے پور (جو یقیناً पये पुर پڑھا جائے گا)

(۲) پئ اِے پور

آناو = (۱) آنا او (۲) آن ناو، (۳) آن نَ اَو (حالانکہ آخری ہجّے میں واؤ اور ہمزہ کی ملی ہوئی آواز برقرار نہیں رہ جاتی)

کھڑ کائے = (۱) کھڑ کا یے (۲) کھڑ کئیے (खड़काये)

بہرائچ = (۱) بہرا اِچ (۲) بہرایچ (बहराय च)

خانۂ خدا = خانہ اے خدا (۲) خانا اے خدا (۳) خانائے خدا (खानाये ख़ुदा) (۴) خانا یے خدا (खानाये ख़ुदा)

ہیئت = ہے ات (۲) ہے یت (جو صحیح تلفظ نہ جاننے والے پڑھتے بھی ہیں) (۳) ہا اے یت (۴) ہَ اِے یت

زائران حرم = زا اِے رانِ حرم (۲) زا یرانِ حرم (ज़ायराने हरम)

لاؤ = (۱) لا ؤ (واؤ کی خفیف آواز اور ایک یا دو کی رک جانے کے ساتھ) (۲) لا او (واؤ کی کھینچی ہوئی آواز) اسی طرح دباؤ کو بھی سمجھنا چاہیے۔

آئینہ = آ اِی نا (۲) آیے نا (۳) آیِ نا دونوں طرح کی آوازوں میں (۱) ؏ آئینۂ فلک کو نہ تھی تاب و تب کی تاب

(۲) آئینہ سا شاہد قدرت کو دکھلائی ہوئی۔

منارۂ عظمت = منارہ اے عظمت (۲) منارہ یے عظمت

ان میں سے اکثر الفاظ اور ترکیبوں کو جدید تحریر میں، اگر نظم کی صورت میں لکھا گیا تو تمام عروضی پابندیاں جس میں حسن توافق زحافات اور لفظی استحکام جیسے شکست ناروا وغیرہ شامل ہوں گے، برقرار نہیں رہ سکتیں۔ تجزیے کے ساتھ صوتی ہم آہنگی بھی باقی نہ رہے گی اس کے ساتھ ساتھ الفاظ پر صحیح اعراب کی یادداشت از بس ضروری ہوگی جس کی پروا اردو میں کبھی نہیں کی گئی اور پھر مختلف اوقات میں مختلف ہجّے ان الفاظ کے لیے بھی لکھنی پڑیں گی جنھیں ہم ایک ہی طرح لکھ کر حسب موقع دونوں طرح پڑھ لیتے ہیں۔ مثال کے لیے ایک شعر لیا جاتا ہے

کیا بڑھ کے الیاس نے آؤ آؤ　　چڑھانے لگے خضر منّت کی ناؤ

یہ شعر دراصل بحر متقارب میں ہے اور اس کے ارکان فعولن، فعولن، فعلن فعول، ہوتے ہیں۔ نئے طرز تحریر میں اس کے ارکان فعولن، فعولن، فعولن، فعولن بھی ہوں گے۔ حروف کی حرکت، سکون اور کشش کا احساس ختم ہو جائے گا۔ کیونکہ اوپر ایک جگہ ہمزہ ساکن ہے جبکہ دوسری جگہ متحرک ہو جاتی ہے۔ دراصل واؤ میں اس کی آواز کے ساتھ ہمزہ کی خفیف صوتی کیفیت شامل ہے جو جدید طریقے میں رہ ہی نہیں سکتی جب تک کہ اسے آؤ (आओ) نہ لکھا جائے اور اس طرح فعول اصل بحر فعولن میں تبدیل ہو جائے گا۔ اسی طرح ؏

ہاں اب بھی جو منارۂ عظمت ہے وہ حسین

کو دو طریقوں سے پڑھنا پڑے گا (۱) ہاں اب بھی جو منار اے عظمت ہے وہ حسین (جیسے عام طور پر پڑھنے والے منار اے عظمت (मिनार ऐ अज़मत) پڑھیں گے) (۲) ہاں اب بھی جو منارہ اے عظمت ہے وہ حسین (جیسے عام پڑھنے والا جس کو ہمزہ کے خفیف صوتی آہنگ کی مزاولت ہی نہ رہ جائے گی मिनारह ऐ अज़मत پڑھے گا) (۳) ہاں اب بھی جو منار یے عظمت ہے وہ حسین۔ ایک صورت یہ بھی ہے (جسے عام پڑھنے والا मिना रह ये अज़मत پڑھے گا)۔ کچھ مصرعوں میں نداؔئیہ صورت پیدا ہو جائے گی اور جن کے معنی بالکل مختلف ہو جائیں گے۔ مثال کے طور پر چند مصرعے ہمزہ کے ساتھ اور بغیر ہمزہ کے استعمال کے دیکھیے اور ان کے معانی پر غور کیجیے۔

؏ گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

؏ ہم کو منظور تنک ظرفئ منصور نہیں

؏ دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں

؏ وصل زنگار رخ آئینۂ حسن یقیں

انھیں بالترتیب یوں لکھیں گے

؏ گفتہ اے غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں (اے غالب)

؏ ہم کو منظور تنک ظرفی اے منصور نہیں (اے منصور)

؏ دہر جز جلوہ اے یکتائی اے معشوق نہیں (اے معشوق)

؏ وصل زنگار رخ آئی نہ اے حسن یقیں (اے حسن یقیں!)

ان مصرعوں کے مطالب میں بغیر ہمزہ کے استعمال کے کیا تبدیلی ہو گئی یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ اردو کے لب و لہجے سے واقف شخص ایک نظر ڈال کر سمجھ سکتا ہے۔

کچھ الفاظ ایسے ہیں جنھیں ہمزہ ہٹا کر 'ی' سے کام چلانے کا مشورہ ہے۔ ایسے الفاظ کے تلفظ تبدیل ہو جانے کا غلط حد تک امکان ہے (حالانکہ اردو والوں نے بہت سے الفاظ کے تلفظ بدلے ہیں لیکن یہ صورتیں کثرت استعمال سے خود ہی بدلتی گئیں) جیسے آئینہ لکھنے کی جو مختلف صورتیں اوپر بتائی گئی ہیں ان میں ایک صورت آیے نا ہے کو منقوطا اس لیے کرنا پڑے گا کہ کہیں آیے نا، نہیں آئے کے مترادف نہ ہو جائے۔ ساتھ ہی ساتھ آئینہ میں خفیف 'ی' کی آواز کو واضح کرنے کے لیے بھی، اسی طرح ہیئت، چاہیے، خانۂ خدا کو بالترتیب ایسے تلفظ کے ساتھ لوگ پڑھنا شروع کر دیں گے۔

आयेना , चाह ये (چاہیے) है सत, खाना ये ख़ुदा

درست ہے کہ اکثر لوگ اب بھی ایسے کچھ الفاظ اسی طرح

(بقیہ ص ۱۱)

(باقی نوٹ کالم صفحہ کا) کیا گیا ہے اسی طرح املا کی صورتیں بھی مکسر طریقے کو ہی پسن کی بجائے پہنچی ہجات تا بجائے چاپتا، جیت ناپائے جیتنا ملاحظہ ہو مقدمہ کربل کتھا مُشتملہ مرتبہ مالک رام اور مختار الدین ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ۔

محمد منشاء الرحمٰن خاں منشاء

شہید امن

اے بہادر رہنما اے قائدِ عالی وقار
ہند کیا سارا جہاں ہے تیرے غم میں سوگوار
کیا بتائیں کس قدر ہے موجبِ رنج و ملال
بعدِ کارِ خیر یہ تیرا اچانک انتقال
سخت نازک موقعہ پر تجھ کو کھو بیٹھے ہیں ہم
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا مقامِ رنج و غم
تیری مرگِ ناگہاں پر امن عالم کے امیں
"آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں"
تیرے اٹھ جانے سے محفل کا عجب عالم ہے آج
جس کو دیکھو وہ سراپا شیون و ماتم ہے آج
تھی غمِ نہرو سے طاری روح پر افسردگی
خشک ہونے بھی نہیں پائی تھی آنکھوں کی نمی
سانحہ رحلت کا تیری یک بیک واقع ہوا
حشر کا سا ایک عالم دل پہ طاری ہو گیا
اے بہادر راہبر اے صاحبِ والا صفات
خاص بہبودیٔ ہندوستاں تھی تیری ذات
تو سیاست کی تیرگی میں نور کا مینار تھا
امن دشمن سرکشوں سے برسرِ پیکار تھا
شانتی کا تو سدا دنیا کو دیتا تھا پیام
تو ہی سچا تھا جواہر لال کا قائم مقام
مسئلے بہت مشکل جو ملک میں پیدا ہوئے
تیری ہی فہم و فراست نے انھیں حل کر دیئے
تو ثبوتِ عزم و ہمت ہر گھڑی دیتا رہا
ناؤ بھارت دیش کی طوفان میں کھیتا رہا
مظہرِ جذب وفا تھے تیرے سب قول و عمل
تھے ارادے تیرے پختہ عزم تھے تیرے اٹل
جنگ کی صورت میں اک آفت تھی جب سر پر کھڑی
دیکھ لی دنیا نے تیری جرأت و مردانگی
دل میں تیرے درد بے پایاں تھا ملک و قوم کا
آخرش یہ درد دل ہی جان لیوا بن گیا
تھی قیامِ امن ہی تیری مقدس آرزو
اس کی خاطر تا دمِ آخر رہا مصروف تو
کارنامہ جو کیا تو نے بہ شہرِ تاشقند
ہو گیا ہے اس سے تیرا اور بھی رتبہ بلند
راہِ امن و آشتی میں جان کی تو نے فدا
مرحبا اے شاستری اے شاستری صد مرحبا!

—— ۰ ——

آج کی اردو شاعری میں ہندوستانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے

فراق گورکھپوری

شاید ہندی کی تحریک میں شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ ارادے کارفرما تھے یعنی مغربی ہندی یا کھڑی بولی کو ایک ایسی شکل دی جائے جس کے خط و خال ایران و عرب کے نہ ہوں بلکہ گنگا جمنا کے دوآبے کے ہوں۔ اس نیک ارادے سے اردو کے بہی خواہ کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ صرف اردو یا ہندی نہیں۔ دنیا کے جتنے ادب ہیں۔ ان کی بنیاد عوام و خواص کی روزانہ کی غیر ادبی بول چال ہے۔ جسے ہم ادبیت کہتے ہیں وہ اٹھانوے فی صدی غیر ادبی بول چال کے چابک دستانہ استعمال کا نام ہے میں ادبیت کو تابندہ تا خواندگی کہتا ہوں۔ تو جب ہم اردو کی صفت اور طرزِ بیان اور بیان میں اصلاح یا نشو و نما کریں تو اس کام سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا ہمیں اردو کو بدلنے کا تو حق ہے اور اسے ہم چاہیں تو ہندی کہیں لیکن ہندی کے نام پر کروڑوں ہندی یا اردو بولنے والوں کی بولی کو بگاڑنے کا حق نہیں ہے اردو اور ہندی کی بولی یعنی بول چال کی زبان بالکل ایک ہے اسے ٹھیس لگائے بغیر ہم نئے اسلوبِ بیان پیدا کریں۔ اس میں فطری تبدیلیاں پیدا کریں مناسب تبدیلیاں پیدا کریں۔ بول چال کو چمکا دینے والی تبدیلیاں پیدا کریں اور ان کوششوں کا نام ہم ہندی کی سیوا رکھیں تو یہ ایک مبارک قدم ہے۔ ایسا نہ کیا گیا تو ہم اردو سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور اپنی چہیتی ہندی کا بھی ستیاناس کر دیں گے۔

کھڑی بولی اردو اور ہندی دونوں کا ناقابلِ تقسیم ورثہ ہے۔ اسی بولی کو چمکانا، اجانا، رچانا، سنوارنا اور سجانا ہے۔ اردو والوں کو بھی اور ہندی والوں کو بھی۔ دنیا بگاڑ کر عاقبت نہیں بنائی جاتی۔ اسی طرح بولی کو بگاڑ کر ادب بھی نہیں بنایا جا سکتا۔۔۔۔۔

اردو کی مخالفت تاریخ کی ستم ظریفی دیکھئے اس وقت شروع ہوئی جب اردو میں زبردست اصلاحی تحریک کا یہ خوشگوار نتیجہ تھا کہ اردو ادب سے قریب قریب تمام فروعی عناصر الگ کیے جانے لگے۔ اور اردو کو ہندوستان کی دھرتی اور اس دھرتی کی زندگی سے قریب کیا جا رہا تھا۔۔۔۔۔

آج کی اردو شاعری نوابوں اور جاگیرداروں کے زمانے کی اردو شاعری نہیں ہے۔ بہت بڑی کایا پلٹ ہوئی ہے۔ آج کے اردو ادیبوں میں بھارتیتا یا ہندوستانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ان کے احساسات۔ ان کی کلپنا۔ ان کے دل کی دھڑکنیں۔ ان کے نظریے ان کا بھارت پریم آج جو بھی ہے جو پورے ملک ہے۔ کاش ہم اس عظیم تعمیری کام میں سب کے سب مل جل کر شریک ہو جائیں اردو اور ہندی زبانیں قیامت تک دو مختلف زبانیں نہیں رہ سکیں گی ہاں کسی قدر ایک دوسرے سے مختلف ہونا کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے سوچ کر ہم آپے سے باہر ہو جائیں ہمیں صرف سیاسی سماجی سیکولرازم یا رواداری کی ضرورت نہیں بلکہ زبان و ادب کے میدان میں بھی سیکولرازم کی ضرورت ہے۔

(سیاست)

صفحہ ۴ سے آگے

پڑھتے ہیں لیکن انھیں ویسا ہی سمجھنا چاہیے جیسے کہ کچھ لوگ انگریزی حروف سادہ ہر کے بے اور بی پڑھتے ہیں۔ یہاں یہ واضح رہے کہ نسبت اور چاہیے کی ہمزہ میں ہمزہ اور ی کی ملی جلی آواز شامل ہے۔ ایک طرح کی diphthongic آواز جسے چاہیے یا چاہئے کی تحریروں سے واضح نہیں کیا جا سکتا۔ لکھنے کی یہ صورتیں بھی

"یہ قدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل کو" یہ قدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل، لکھیں گی جسے ایک طرف تو قاری 'تنگنائیے' پڑھے گا اور دوسری طرف ہمزہ کے استعمال کی نیرنگیوں سے بے خبر ہو کر तंग ना ए ग़ज़ल پڑھے گا یعنی ن کے بعد سے غزل کی غ تک جو ایک پیسٹ دار نائی کی آواز ہے اسے چھوڑ کر ن سے آواز کا سلسلہ توڑ دے گا اور ہمزہ کی آواز کو الگ الف کی رکاوٹی آواز میں بدل لے گا۔ یا پھر اس کو तंगनाये ग़ज़ल پڑھ کر ہندی وا اور کی طرح اردو میں واؤ عطف کو بھی واؤ بالاعلان ادا کر پڑھنے لگے گا۔

ہر زبان کی تحریری تاریخ میں ایسی صوتی ناہم آہنگی کی کچھ مثالیں ضرور ملتی ہیں۔ بلکہ پہلوی اور چند کردی قبائل کی تو ایسی زبانیں بھی ہیں جو لکھی تو دوسری طرح جاتی ہیں لیکن پڑھنے میں ان کا تلفظ بالکل دوسرا ہوتا ہے۔ غیر مشتق زبانوں کے گروہ میں جہاں کوئی اصول نہیں بلکہ الفاظ کے ذخیروں کی یادداشت ہی زبان کی تاریخ کے سفر کو آگے بڑھا سکتی ہے، وہاں علاقائی اثرات صوتی غیر ہم آہنگی سے کیا کیا تبدیلیاں پیدا کرتے ہوں گے؟ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں بھی طرزِ تحریر اصول صوت کا زیادہ پابند نہیں چنانچہ [illegible] (کاؤ) اور [illegible] (ڈیبٹ) اور [illegible] (ٹیٹ) ایسے صوتی تغیرات ہیں جن کی تبدیلیوں کی وجہیں معلم، حیرت زدہ طالب علموں کو نہیں سمجھا سکتا۔ لیکن یہاں "آئین نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا" والی بات نہیں سمجھنا چاہیے۔ اگر بغیر کسی نقصان اور تحریری پیچیدگیوں کو بڑھائے ہوئے، زبان صوتی آہنگ کے لحاظ سے ضبطِ تحریر میں آسکے تو بہت اچھا ہے۔ ہمارے لکھنے والے بھی بہت سی بے جا غلطیاں کرتے رہتے ہیں، 'کئے' خالی ہمزہ سے لکھا جا سکتا ہے۔ اسے مان لینا چاہیے۔ یہیں نقطہ لگانے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح اکثر لوگ ہائے ہوز اور دو چشمی ہے کے صوتی آہنگ کا خیال نہ کر کے 'کہا' بجائے 'کھا' لکھتے ہیں، 'جہاں' بجائے 'جھاں' لکھتے ہیں۔ کئی کئی لفظ ایک ساتھ ملا کر لکھنے کا رواج آج تک چلا ہی جاتا ہے جبکہ بہت سے الفاظ کو عجیب دھوکا پیدا کرتے ہیں۔ کچھ لوگ 'ہے' دو چشمی 'ھ' سے لکھتے ہیں اور پھر اس کے نیچے 'ے' کا لکھن بھی لگاتے ہیں یعنی 'ھے' اس شکل میں (میں خود ایسی غلطی کبھی کبھی کرتا ہوں) اس لیے تعمیری اور ممکن الحل تبدیلیوں کو مان لینا چاہیے لیکن محض توڑ مروڑ سے گتھیوں کو اور الجھا دینا کوئی دانائی کی بات نہ ہوگی۔ ہمزہ کے استعمال کو ترک کر دینے سے مشکلات اور بڑھ جاتی ہیں حل نہیں ہوتیں۔

جدید طرزِ تحریر جو ہمزہ کو ہٹا کر مختلف صورتیں لفظوں کی بنائے گا، علاوہ ان تحریری اور صوتی مشکلات کے جن کا تذکرہ اوپر کیا گیا، چند اور دقتیں پیدا کرتا ہے۔ اس ترکیب تحریر سے ایک جدید تحریر میں لایا ہوا لفظ، تین تین الفاظ کی جگہ گھیرے گا۔ ان لوگوں کے لیے جو ٹائپ رائیٹر سے لکھنے پر قادر نہیں، اس طریقۂ تحریر میں متعدد بار قلم اٹھانے سے وقت کا صرف بھی کافی ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کشمکش میں، اردو کی ملاوٹ کا حسن ہی ختم ہو جائے اور ایک وقت وہ آئے کہ ہر حرف الگ الگ ہو کر اپنی ملاوٹ کا اصول ہی فراموش کر دے۔ پھر ایسی زبان کے لیے جس کی اشاعت، طباعت اور قوت خرید میں انگریزی اور ہندی جیسا اژدہام بھی نہیں، وقت اور کاغذ کے کثرتِ استعمال کا خرچ کیوں برداشت کیا جائے گا۔ کیونکہ پبلشر اپنے خرچ اور منافع پر نظر رکھتا ہے اردو کی اشاعت اور رسم تحریر سے اسے کم دلچسپی یا بالکل دلچسپی نہیں ہوتی۔ یہی نہیں بلکہ پھر اردو کو جس کی اشاعت روز بروز زیرِ بحث ایک مسئلہ بنتی جاتی ہے، اس طرزِ تحریر کے لیے نئے کاتب (اگر مصنف کو ٹائپ پسند نہیں اور زیادہ تر مصنفین اور قارئین ایسے ہی ہوتے ہیں) تربیت کرنے پڑیں گے جو اس طرزِ املا و انشاء سے واقف ہوں۔ بچوں کو پڑھانے کے لیے عام معلم نہیں بلکہ اصول صوتیات کے ماہر پروفیسر تلاش کرنے ہوں گے جو سب کے بس کا کام نہیں۔ اپنے بچوں کو دو چار روپے دے کر اس دور میں ایک غیر منافع بخش زبان پڑھانے والا فرد شاید اس کا دماغ رکھتا ہے اور نہ وسعت (کیونکہ زبان بغیر لوگوں کے پڑھے ہوئے صرف اصولوں کی بنیاد پر نہیں بڑھتی) اور اس طرح املا و انشاء کا طریقہ صرف مدرسہ اور طریقۂ تعلیم کا مسئلہ نہیں رہ جاتا بلکہ معاشی اور اقتصادی مسئلہ بھی بن جاتا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب اس نئی طرزِ تعلیم سے واقف ہو کر لوگ نکلیں گے تو پرانا طریقہ املا و انشاء خود بخود ختم ہوتا جائے گا۔ دوسری زبانوں کے لیے یہ خیال شاید صحیح ہو (حالانکہ امریکی طرزِ تحریر آج تک ہجے کے معاملے میں انگریزی دنیا کو زیادہ متاثر نہیں کر سکا) لیکن اردو جس دور سے ہندوستان میں گزر رہی ہے وہاں اسکولوں میں اس کی معمولی تعلیم کا تو ٹھیک انتظام ہوتا نہیں، بھلا سائنٹفک لسانی اصول کون سکھائے گا۔ (ابھی تک جو کتابیں پاکستان سے چھپی ہیں ان میں بھی ایسی رسمِ تحریر دیکھنے میں نہیں آتی حالانکہ وہاں اردو کے لیے یہ مجبوریاں اور دقتیں نہیں ہیں)۔

اردو میں اس طریقۂ جدید کی ترویج و تبلیغ کی کوشش خاص اس وقت پر غالباً اس مقصد سے شروع ہوئی ہے جو آج کل دو چار غیر ملکی طالب علم کبھی کبھی بھولے بھٹکے اردو پڑھنے آ جاتے ہیں

اور جو عام طور پر ایسی یورپی زبانوں کے بولنے والے ہوتے ہیں جن کا رسم خط اور زبان کا کینڈا زیادہ سائنٹفک سمجھا جاتا ہے۔ ہندی والوں نے بھی اپنے طرز انشا کو تبدیل کیا ہے۔ لیکن ہم اردو والوں کا مسئلہ بالکل مختلف ہے۔ یہ کہاں کی عقل مندی ہوگی کہ چند غیر ملکی طلبا کی آسانی کی خاطر اپنے ملکی محبان اردو کو ان آسانیوں سے محروم کر دیا جائے جو وقت، معاشیات اور اقتصادیات کی کشاکش نے ان کو محدود طریقہ پر دے رکھی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ رسم تحریر جس کی ایک روایت رہی ہے اور جو اپنا سلسلہ آج بھی دور دور سے ملائے ہے اس کے ڈھانچے کو بھی متزلزل کر دیا جائے۔ ترقی کی راہیں نکالنا بڑی اچھی بات ہے لیکن ترقی کے ایسے راستے جو اور مشکلوں میں پھنسا دیں انھیں صرف ایڈونچر سمجھنا چاہیے اور اردو جس منزل سے گزر رہی ہے اسے اپنی روایات چھوڑ کر ایڈونچر کرنے کا ہرگز موقع نہیں جس ڈھرے پر وہ چل رہی ہے فی الحال وہی اس کے لیے سب سے بہتر اور سیدھا راستہ ہے۔

اسی بحث کے ساتھ ایک سوال اور اٹھتا ہے۔ دنیا میں اس رسم خط کے جاننے والے جس میں اردو لکھی جاتی ہے، جزیرہ عرب کے علاوہ مراکش، مصر، تیونس، الجیریا، سوڈان، ایتھوپیا، سومالی لینڈ، زنجبار، لبنان، شام، عراق، افغانستان، ایران، کردستان، ملایا، جاوا، روس کے چند حصے، اسرائیل اور چین کے کچھ حصے ہیں، سب کی رسم تحریر کم و بیش یہی ہے۔ ابھی تک ایران[1] و عرب ممالک کے چھاپے خانوں سے جو کتابیں شائع ہو کر آ رہی ہیں وہ بھی تقریباً اسی طرز املا اور انشا کے ساتھ ہیں۔ تو کیا ہمارے ہمزہ کو چھوڑ دینے سے تمام ملک جو سامی رسم خط رکھتے ہیں اپنا رسم خط بدل دیں گے؟ اگر نہیں تو ہم اپنے بچوں پر سامی علوم کے دروازے بند کریں گے (مصری، ج، گ کی تبدیلی نئی بات نہیں ہے) یا پھر بچوں کو ہمزہ کا استعمال بھی بتایا جائے اور جدید طرز انشا بھی جو اتنا آسان کام نہیں جتنی آسانی سے سوچا جاتا ہے۔ کیونکہ جدید طرز انشا اور املا کا عادی آسانی کے ساتھ نہ تو ان تحریرات کو پڑھ سکے گا اور نہ ان الفاظ کی صحیح صوتی آہنگ کو اپنی ذہنی گرفت میں لے سکے گا۔

دو ایک دشواریوں کی طرف اور توجہ کر لینی چاہیے۔ نئے طرز انشا میں مروجہ اعراب کے ساتھ ساتھ بہت سے صوتی اعراب کو بھی پابندی کے ساتھ استعمال کرنا ہوگا، مثلاً کہاں ہ کی، ی کی آواز کو کھینچ کر پڑھنا ہے اور کہاں نہیں، کہاں حرف ساکن ہے اور کہاں متحرک۔ کیکلیٹی، لکھنے کے لیے ک، ی، لکھا جائے گا۔ اگر ک پر زیر نہ لگا تو متحرک اور ساکن حرفوں پر علامت دیکھنے کا عادی اسے ساکن سمجھ بیٹھے گا اور پھر کیک اسی طرح پڑھنے کے بھی امکانات ہیں (یہ درست ہے کہ موقع استعمال کچھ مدد کرے گا مگر ہمیشہ نہیں) اور اس طرح ایک طرف تو لفظوں کا تلفظ بگڑے گا اور دوسری طرف کتابت کا حجم اعراب سے اس قدر بوجھل ہوگا کہ عبارت سے زیادہ نقش و نگار نظر آئیں گے۔ اردو میں پہلے بھی کچھ کتابیں جزم اور شد، سکون و حرکت کے نشانوں کے ساتھ چھپتی تھیں لیکن چھپائی اس قدر بھدی اور بدنما ہو جاتی تھی کہ لوگوں نے اس طریقے کو چھوڑ دیا۔ پھر اردو میں اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو الفاظ کے صحیح اعراب سے زیادہ واقف نہیں بلکہ بغیر اعراب لگے الفاظ کو، صحیح جاننے والا ٹھیک پڑھ لیتا ہے اور ان الفاظ کو نہ جاننے والا لکھتا تو اسی مروجہ طریقے سے ہے لیکن پڑھتا اس طرح پر ہے جس آواز کے ساتھ لفظ اس کی زبان پر چڑھا ہے۔ اب جبکہ ہمزہ کو ہٹا کر اس کی آواز کو اعراب سے ظاہر کرنا ہوگا تو لامحالہ دوسرے الفاظ کو بھی لکھنے والا معرب کرنے لگے گا اور اس طرح لفظوں کے غلط اصوات جو اس کی زبان پر چڑھے ہیں اسی آواز میں معرب ہو جائیں گے۔ ایسی صورت میں اردو الفاظ کے صوتی نحوی اور تحریری نظام میں غلطیاں بے انتہا ہونے لگیں گی اور ایک غلط قسم کا جامد نہ تغیر بھی رونما ہوگا۔ ہمزہ یا کسرہ کے خفیف صوتی تغیر کی کیف سامانیاں ختم ہو جائیں گی اور اردو میں بھی بعض الفاظ کے نہ لکھ سکنے کی مجبوری پیدا ہو سکتی ہے (جیسے ہندی میں عمر اور بکر نہیں لکھا جا سکتا)۔

اس طرح ہمزہ کو ہٹا کر اس کو مختلف قسم سے صوتی آہنگ کی بنیاد پر لکھنے کی کوشش کرنا کسی خوشگوار تبدیلی کی بشارت نہیں۔ اردو کے حروف اور اعراب، اس کے صوتی، صرفی اور ترکیبی نظام میں کوئی گڑبڑی پیدا نہیں کرتے۔ جو لوگ زبان کی ان صورتوں کو برداشت کرتے ہیں وہ محض اس لیے اردو زبان کو سیکھنے سے پرہیز نہیں کریں گے کہ انھیں ہمزہ کا وجود بے کار اور لکھنے میں مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اور اردو کے طالب علم سے یہ امید کرنا کہ وہ ماہر علم زبان اور علم صوتیات ضرور بن جائے گا اور تب اسے ہمزہ کا مصرف بیکار اور مشکل معلوم ہوگا، اردو والوں کی موجودہ محدود توقعات سے بہت آگے سوچنا ہے۔ اتنا آگے کہ جب یہ بھی نہیں بتایا جا سکتا کہ زبانیں کیا ہوں گی۔

[1] ایران میں بھی ایک مرتبہ ہمزہ ہٹانے کی تحریک چلی تھی مگر کامیاب نہیں ہوئی۔

مراسلات

فلسفۂ شعر کی اور حقیقت ہے کیا
حرفِ تمنّا جسے کہہ نہ سکیں روبرو

جناب عابد کیفی صاحب نے ۲۲ دسمبر ۱۹۹۵ء کے "ہماری زبان" میں دریافت فرمایا ہے کہ یہ شعر ؎

فلسفۂ شعر کی اور حقیقت ہے کیا — حرفِ تمنّا جسے کہہ نہ سکیں روبرو

بحر بسیط میں ہے یا بحر منسرح میں؟

جواباً عرض ہے کہ قبل اس کے کہ شعر زیر بحث کی بحر پر غور کیا جائے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ عروضیوں نے اوزان متداولہ کے لیے بحریں قائم کر دی ہیں اور ہر بحر کے افاعیل مقرر ہیں۔ اگر شعر کے وزن میں کسی بحر کے افاعیل سالم آئیں یعنی رکن میں زحافات و علل کا استعمال نہ کیا گیا ہو تو وہ سالم بحر کا شعر کہلائے گا۔ ورنہ زحافات بیان کر کے شعر کی بحر قائم کی جاتی ہے۔

مثلاً صفی لکھنوی کا یہ شعر ؎

شب فرقت کے غم جھیلے ہوئے کا دم نکلتا ہے — یہ عالم ہے کہ منہ پھیرے ہوئے عالم نکلتا ہے

بحر ہزج سالم میں ہے۔ یعنی مفاعیلن آٹھ بار

اور میر تقی میر کا یہ شعر ؎

زانو پہ ترے سر ہو اور جان نکل جائے — مرنا تو مسلّم ہے ارمان نکل جائے

بحر ہزج مزاحف کا شعر ہے۔ کیونکہ اس کا وزن مفعول مفاعیلن چار بار ہے یعنی اس کے بعض ارکان اخرب ہیں۔ اس لیے بحر ہزج مثمن اخرب ہے۔

یہ واضح رہے کہ بحر کے افاعیل کے زحافات بھی مقرر ہوتے ہیں۔ ہر زحاف استعمال کر کے وزن حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً غالب کا یہ شعر ؎

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا — جتنے عرصہ میں مرا لپٹا ہوا بستر کھُلا

بحر رمل مثمن محذوف میں ہے۔ وزن فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلن دو بار ہے۔ اب اس کی تقطیع یوں کریں:

فاعلن مستفعلن مستفعلان

اور اسے بحر رجز مثمن مرفوع کا شعر قرار دیں تو جائز نہ ہوگا۔ اور یہ تقطیع غیر حقیقی کہلائے گی۔ اسی طرح صفی کے شعر کو بحر وافر مثمن معصوب کا شعر نہیں کہہ سکتے۔ اگرچہ مفاعلتن عصب سے مفاعیلن ہو جاتا ہے۔

اگر ہر بحر کے افاعیل میں ہر زحاف رائج ہوتا تو اتنی بحروں کی اختراع کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ بحر ہزج بحر وافر معصوب ہے۔ اور بحر رجز بحر کامل مضمر ہے۔ بحر مدید کی تو سرے سے ضرورت ہی نہ تھی۔ اس کے ارکان فاعلاتن فاعلن چار بار ہیں۔ اسے بحر رمل مثمن قرار دے سکتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس۔۔۔

حقیقت یہ ہے کہ مثلاً بیچ کے اوزان ایک بحر کی شاخ قرار دئے گئے ہیں اور مدید کے لہجے کو رمل سے کوئی مناسبت نہیں۔

اب شعر زیر بحث کو لیجئے ؎

اس شعر کا وزن مفتعلن فاعلن چار بار ہے بحر منسرح کے ارکان مستفعلن مفعولات چار بار ہیں۔ اس بحر میں طی اور کسف کے عمل سے وہی وزن ہو جاتا ہے جو شعر مذکور کا ہے۔ اس شعر کی بحر منسرح مطوی مکسوف ہے۔

بحر بسیط کے ارکان مستفعلن فاعلن چار بار ہیں۔ اب اگر مستفعلن کو مطوی کیا جائے تو وہ وزن حاصل ہو جائے گا جو شعر کا ہے۔ مگر بحر بسیط میں مستفعلن کو طے نہیں کرتے۔ یہ رکن سالم رہتا ہے۔ زحافات کا عمل صرف فاعلن پر ہوتا ہے۔ یہ بحر مترنم نہیں ہے۔ اس لیے اس کا استعمال اردو میں کم ہوتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ شعر مذکور کو بحر بسیط کا شعر قرار دینے سے صرف ایک ہی زحاف سے کام چل جاتا ہے تو یہ بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ اسی وزن میں فاعلن کی اذالت بھی جائز ہے۔ غالب کی ایک ہی غزل کے دو شعر ملاحظہ کیجئے۔

اے بہ خلا و ملا خوئے تو ہنگامہ زا — باہمہ در گفتگو بے ہمہ در ماجرا

اس شعر کا وزن مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلن دو بار ہے۔ دوسرا شعر دیکھئے۔

آب نہ بخشی بہ زور خون سکندر بہ در — جان نہ پذیری بہ گنج نقد خضر باز دہ

اس شعر میں [illegible] ہے۔ وزن مفتعلن فاعلان مفتعلن فاعلن دو بار ہے۔ یہی سبب ہے کہ کتب عروض میں بحر بسیط کی شاخوں میں یہ وزن نہیں ملتا۔ بحر منسرح کی فروع میں برابر موجود ہے۔

بحر بسیط پر ہی موقوف نہیں۔ دوسری بحروں سے بھی یہ وزن اختراع کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً بحر مجتث کے ارکان مستفعلن فاعلاتن چار بار ہیں۔ مستفعلن پر طی اور فاعلاتن پر حذف کے عمل سے یہ وزن حاصل ہو جاتا ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ بحر مجتث میں رکن مستفعلن مخبون آتا ہے۔ مطوی نہیں۔

بہر صورت عروضیوں کی قائم کردہ قیود کے مطابق شعر زیر بحث بحر منسرح میں ہے۔

(فرید)

کچھ مضمون "عشق نامہ" کے سلسلے میں

ہماری زبان مورخہ ۸ فروری ۱۹۹۶ء کے مخدوم کالم ۵ میں رجب علی بیگ سرور کی کتاب سرور سلطانی کے بارے میں لکھا گیا ہے۔

"یہ فردوسی کی نظم شمشیر خانی کا منثور اردو ترجمہ ہے۔ مثنوی حزن اختری کے ناشر۔۔ نے اسے واجد علی شاہ کی تصنیف شمار کیا ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ شمشیر خانی کا مصنف فردوسی نہیں ہے اور وہ نظم بھی نہیں ہے۔ توکل بیگ حسینی واقعہ نویس حضور نے ۱۰۶۳ھ میں شمشیر خاں حاکم غزنین کے حکم سے شاہنامۂ فردوسی کا خلاصہ فارسی نثر میں لکھ کر تاریخ شمشیر خانی اس کا نام رکھا۔ بعد کے اکثر لکھنے والوں نے لفظ 'تاریخ' حذف کر کے صرف 'شمشیر خانی' کے نام سے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کتاب کا کوئی مطبوعہ نسخہ میرے علم میں نہیں ہے۔ لیکن اس کا ایک قدیم قلمی نسخہ ۱۱۸۸ھ کا لکھا ہوا میرے کتب خانے میں موجود ہے۔

ایک مثنوی کا ذکر حزن اختری کے نام سے کیا گیا ہے۔ یہ مضمون نگار کا سہو قلم معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اسی صفحے کے ایک فٹ نوٹ میں اس کا صحیح نام 'حزن اختر' لکھا گیا ہے۔

مقولہ بالا عبارت سے آگے بڑھ کر ڈاکٹر سید عبداللہ کے نام کے ساتھ لفظ 'مرحوم' لکھا گیا ہے لیکن جہاں تک مجھے علم ہے ڈاکٹر صاحب بحمد اللہ زندہ و سلامت موجود ہیں۔

(سید مسعود حسن رضوی ادیب)

انجمن ترقی اردو کریم نگر کے زیر اہتمام یوم اُردو

کریم نگر۔ ۸ر فروری انجمن ترقی اردو شاخ ضلع کریم نگر کی جانب سے ۶ر فروری کو دن کے گیارہ بجے، بصدارت مسٹر جے۔ چوکا راؤ صدر نشین ضلع پرشید کریم نگر، بہ سلسلۂ "یوم اردو" ایک جلسۂ عام منعقد کیا گیا۔ مسٹر عابد علی خاں ایڈیٹر روزنامہ "سیاست" حیدر آباد نے بحیثیت مہمان خصوصی اس جلسہ میں شرکت کی۔

ابتداء میں مسرز بسم اللہ خاں بسمل، افتخار علی انور، ایم اے۔ غفار برق، محمد ریاست علی صدیقی تاج کریم نگری اور چوپٹ آر پرالوی نے "اردو" کے عنوان سے اپنی نظمیں اور قطعات پیش کیے۔

مسٹر گمندلال مصر، صدر انجمن ترقی اردو شاخ ضلع کریم نگر نے کہا کہ تلگو کے ساتھ اُردو کو بھی قانونی موقف ملنا چاہیے۔ یہ ہمارا کوئی نیا مطالبہ نہیں ہے بلکہ ارباب مقتدر نے اردو کو علاقائی زبان تسلیم کیا ہے اور اس تعلق سے آندھرا پردیش کے ہر چیف منسٹر نے بارہا اعلان کیا ہے۔ اب جبکہ تلگو کو سرکاری زبان بنانے کے سلسلے میں ریاستی اسمبلی میں قانون پیش ہونے والا ہے۔ اس موقع پر یہ بھی ضروری ہے کہ اردو کو قانونی موقف عطا ہو۔

مسٹر عابد علی خاں ایڈیٹر روزنامہ "سیاست" حیدر آباد نے اردو کے قانونی موقف کے بارے میں تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آندھرا پردیش پہلی ریاست ہے جس کا قیام لسانی بنیادوں پر عمل میں آیا ہے۔ آندھرا پردیش کو قائم ہوئے نو سال بیت چکے ہیں مگر اب تک تلگو کو سرکاری زبان نہیں بنایا جا سکا ہے۔ اب اس تعلق سے مزید تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔ تلگو کو سرکاری زبان بنانے کے لیے جو مسودۂ قانون پیش کیا جانے والا ہے، اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جس طرح حکومت آندھرا پردیش نے اردو کے ساتھ رواداری کا سلوک کر کے سارے ہندوستان میں ایک امتیازی مقام حاصل کیا ہے اسی طرح اردو کو قانونی موقف عطا کر کے حکومت آندھرا پردیش سارے ملک کی رہنمائی کرے گی۔ آزاد رکن اسمبلی مسٹر داؤدی لال گوپال کرشنیا کے غیر سرکاری بل میں انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کی جانب سے پیش کردہ ترمیمات کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے یہ توقع ظاہر کی کہ حکومت ان ترمیمات کو قبول کرے گی۔

مسٹر رام پال لاہوٹی سکریٹری جسٹس ایسوسی ایشن کریم نگر نے کہا کہ یہ بڑے فخر و مسرت کی بات ہے کہ حکومت تلگو کو سرکاری زبان بنانے والی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ ہم سب کی یہ خواہش ہے کہ اردو کو بھی اس کا حق ملے۔

مسٹر جگناریڈی ایڈوکیٹ نے کہا کہ اردو کی جنم بھومی ہندوستان ہے۔ اردو دستور ہند کی ایک مسلمہ زبان ہے اور یہ سارے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور آندھرا پردیش کی دوسری بڑی اور اہم زبان ہے۔ اس کو علاقائی زبان کی حیثیت سے یقیناً قانونی موقف ملنا چاہیے۔

مسٹر ایم۔ رام گوپال ریڈی ایم۔ ایل۔ اے نے کہا کہ ہم سب کی یہ خوش نصیبی ہے کہ ہمارے ضلع کے ایک اہم جلسہ میں حیدر آباد کے ایک ممتاز جرنلسٹ مسٹر عابد علی خاں شریک ہیں۔ اردو ہندو مسلم اتحاد اور یکجہتی کا ایک بے مثال نمونہ ہے۔ اردو پر مجھے فخر ہے کہ یہ ہمارا ورثہ ہے، اس کی حفاظت ہمارا اولین فرض ہے زبان کو مسئلہ احساسات، جذبات اور تہذیب سے وابستہ ہے۔ اس لیے اس مسئلے کی یکسوئی بڑی حد تک کے ساتھ کی جانی چاہیے۔

شریمتی پریم لتا دیوی میر مجلس بلدیہ کریم نگر نے جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اردو ہماری ایک اہم زبان ہے اور ہمارے اظہار خیال کا ایک بہتر ذریعہ ہے۔ اردو ایک علمی خزانہ ہے، اس سے محروم ہونا کون پسند کرے گا۔ اس لیے حکومت سے ہمارا یہ مطالبہ ہے کہ وہ سرکاری زبان کی قانون سازی کے وقت اردو کو بھی ایک اہم مقام دے۔

مسٹر گمندریڈی صدر پنچایت سمیتی حسن آباد نے کہا کہ اردو کو ترقی دینے میں ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور دوسرے طبقوں نے بڑی کاوشیں کی ہیں۔ اب حکومت کی باری ہے وہ بھی بہتر اور جمہوری خطوط پر زبان کے مسئلے کی یکسوئی کرے اور انگریزی کو جلد سے جلد ہٹا کر تلگو اور اردو دونوں زبانوں کو سرکاری اغراض کی تکمیل کے لیے استعمال کرے۔

مسٹر ایم سید وحید الدین صدر جمعیۃ العلماء ضلع کریم نگر نے کہا کہ اردو کو اس کا اپنا حق دے کر حکومت اپنی رواداری، انصاف پسندی اور جمہوریت کا بہتر ثبوت پیش کر سکے گی۔

مسٹر خواجہ جمال الدین احمد ایڈوکیٹ نے کہا کہ اردو ایک عوامی زبان ہے اور عوامی زبان کی ترقی اور اس کے تحفظ کے لیے عوامی حکومت پر ایک بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

مسٹر جے۔ چوکا راؤ صدر نشین ضلع پرشید کریم نگر نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے تعلق سے حکومت نے اب تک جس فراخدلی کا ثبوت دیا ہے، یقیناً اسی طرح سرکاری زبان کے مسودۂ قانون میں وہ اردو کو شامل کرے گی۔ انھوں نے کہا کہ صرف قانونی حق دے دینا ہی کافی نہیں ہے، اس پر بہتر طریقے پر عمل بھی کیا جانا چاہیے۔ اس لیے کہ مختلف زبانوں اور شعبوں کی مساوی ترقی سے ہی ملک آگے بڑھ سکے گا۔ انھوں نے چیف منسٹر مسٹر کے۔ برہمانند اریڈی کی اردو دلچسپی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے موجودہ چیف منسٹر خود اردو بولنے اور لکھنے پڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں تو وہ خود اردو کو کیسے نظر انداز کر سکیں گے۔ اردو کو ہم

سب کی تائید حاصل ہے۔ مجھے یقین ہے کہ حکومت اردو کو قانونی موقف عطا کرنے میں کبھی بھی پیچھے نہیں ہٹے گی۔

صدر جلسہ نے ایک قرارداد پیش کی جس میں تلگو کو سرکاری زبان بنانے کا خیر مقدم اور اردو کو قانونی موقف دینے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس قرارداد میں انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کی پیش کردہ ترمیمات کی تائید بھی کی گئی ہے۔

مسٹر ابوالمکارم غازی الدین کمال کریم نگری معتمد انجمن ترقی اردو شاخ ضلع کریم نگر نے ضلع پریشد، پنچایت سمیتیوں، بلدیات اور دوسرے اداروں سے اپیل کی کہ وہ بھی اپنی طرف سے اردو کے قانونی موقف کے لیے حکومت سے مطالبہ کریں۔ معتمد انجمن کے شکریے کے ساتھ جلسہ کا اختتام عمل میں آیا۔ (سکریٹری)

تلوک چند محروم کی علمی و ادبی خدمات کو خراج تحسین

انجمن ترقی اردو دلی اسٹیٹ کے زیر اہتمام

جلسۂ عام

نئی دہلی ۸ر فروری، آج شام انجمن ترقی اردو دلی اسٹیٹ کی طرف سے کانسٹی ٹیوشن کلب کے ایک عام جلسہ میں اردو کے ادیبوں، دانشوروں شاعروں اور دوسرے اہل علم نے پروفیسر تلوک چند محروم کو خراج عقیدت پیش کیا۔ جلسہ کی صدارت خواجہ غلام السیدین صاحب نے کی۔ آخر میں سیدین صاحب کے چلے جانے کے بعد پنڈت سندر لال نے فرائض صدارت ادا کیے۔ جناب گوپی ناتھ امن نے محروم صاحب کی شخصیت اور فن سے متعلق ایک مقالہ پڑھا۔ اور ان کی شاعری میں اخلاقی قدروں سے سیر حاصل بحث کی۔

جناب خوشتر گرامی ایڈیٹر بیسویں صدی اور جناب گوپال متل ایڈیٹر تحریک نے اردو صحافیوں کی طرف سے محروم صاحب کی ادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔

خوشتر گرامی صاحب نے اپنی تقریر میں اس بات پر زور دیا کہ محروم صاحب زندگی بھر مشترکہ تہذیب و تمدن کے علم بردار اور مبلغ رہے۔

جناب علی جواد زیدی نے محروم صاحب کی شخصیت اور فن پر تقریر فرمائی اور ان کی شاعری کی اس خصوصیت پر زور دیا کہ جس کے سبب محروم صاحب کا کلام یکے بعد دیگرے تین نسلوں نے یکساں طور پر پڑھا۔ حالانکہ اس عرصہ میں ادبی قدریں اور معیار بدلتے رہے۔ جناب پریم ناتھ در اور کوثر چاند پوری نے اردو افسانہ نگاروں کی نمائندگی کی اور بہترین الفاظ میں محروم صاحب کی شخصیت اور ان کی علمی اور ادبی خدمات کو سراہا۔ تعلیمی اداروں کی طرف سے ڈاکٹر تنویر علوی اور عبد اللطیف اعظمی نے تقریریں کیں اور محروم صاحب کی علمی حیثیت پر روشنی ڈالی۔ ساغر نظامی اور

غلام ربانی تاباں نے حضرت محروم پر تقریر کی۔ شعرائے کرام نے حضرت محروم کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

(الجمعیۃ)

جلسۂ یوم اردو ہندوپور

مورخہ ۵ر فروری ۱۹۷۶ء میونسپل کمپاؤنڈ میں انجمن ترقی اردو ہندوپور کی جانب سے "یوم اردو" کے سلسلے میں ایک عظیم الشان اجلاس منعقد کیا گیا جس کی صدارت پی۔ عبد الوحید صاحب نے کی۔

جناب حاجی پیراں نظامی نے مہمان خصوصی جناب سر بخو اس لاہوٹی کا تعارف کروایا۔ اور اپنی تقریر میں اردو زبان کی اہمیت اور اس کی نشو و نما پر موثر انداز میں روشنی ڈالی۔ نیز منعقدہ اجلاس کے اسباب و علل اور زبان اردو کے لیے جد و جہد کرنے کی ترغیب دلائی۔

مولانا بشیر احمد صاحب نے فرمایا کہ اردو زبان نہ صرف ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے بلکہ بیرونی دنیا میں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو ۱۹۵۵ء میں جبکہ روس تشریف لے گئے تو تاشقند میں آپ کو اردو میں سپاس نامہ پیش کیا گیا اور آپ نے اردو ہی میں اس کا جواب دیا۔

مولوی عبد اللطیف صاحب نائب صدر انجمن ترقی اردو ہندوپور نے اجلاس کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے کہا کہ اس ماہ زبان کے متعلق اسمبلی میں مسودہ قانون پیش ہونے والا ہے جس میں زبان اردو کو قانونی طور پر بحیثیت ثانوی زبان تسلیم کیا جائے۔ اور ہمیں چاہیے کہ اردو کے سلسلے میں انجمن ترقی اردو حیدرآباد کے موقف کی حمایت کریں۔

مہمان خصوصی جناب سر بخو اس لاہوٹی سکریٹری انجمن ترقی اردو حیدرآباد نے فرمایا کہ جس طرح ہمارے علماء نے عربی الفاظ گھڑ گھڑ کر اردو کو دقیق بنا دیا ہے اسی طرح ہندی کے پنڈت بھی اس کی مٹی پلید کر رہے ہیں۔ درحقیقت زبان وہی چلے گی جو دوآبہ گنگا اور جمنا میں چھن کر آئے گی اور اس کا فیصلہ عوام کریں گے۔

آپ نے سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ ہم لوگ اردو کی طرف سے لاپرواہی برت رہے ہیں جس طرح مسجد نہ ہو تو گھر میں نماز پڑھ لیتے ہیں اسی طرح اسکول نہ ہو تو کیا ہم اردو چھوڑ دیں گے؟ ایسا ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتا۔ انسان مذہب بدل سکتا ہے لیکن زبان نہیں بدلتا۔ اس لیے اگر ہم چاہیں تو کوئی زبان فراموش نہیں کی جا سکتی بشرطیکہ متحد رہ کر مناسب جد و جہد کی جائے۔

آپ نے فرمایا کہ ہمیں ہندوستان میں اقلیتی زبان کا تحفظ کرنا ہے۔ لہٰذا ہم حکومت آندھرا پردیش سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ہمارے بچوں کو اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا حق دیا جائے۔ جہاں اردو بولنے والوں کی ۱۰ آبادی ہو وہاں آفسوں، تعلیمی اداروں اور عدالتی شعبوں میں اردو رائج کی جائے تاکہ ہم تعلیم اور دیگر ضرورت زندگی کی تکمیل کر سکیں۔

اس کے بعد صدر جلسہ نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ اردو رابطے کی زبان ہے اس کے جاننے اور سرپرستی کرنے والوں میں ہندو مسلم سبھی برابر کے حصہ دار ہیں۔ اس کی ترقی کے لیے اجتماعی جد و جہد کرنی چاہیے۔ تقریر کے اختتام پر ایک قرارداد پیش کی گئی جسے متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا جس میں اردو کو بحیثیت ثانوی زبان مسودہ قانون میں تسلیم کرنے کی حکومت سے درخواست کی گئی تھی۔ (سکریٹری)

مکتبہ جامعہ کی طرف سے ڈاکٹر عابد حسین، راجندر سنگھ بیدی اور سردار جعفری کے اعزاز میں نشست

مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ بمبئی کی طرف سے ۵ فروری ۱۹۶۶ء کی شام ساڑھے پانچ بجے ایک ادبی نشست ڈاکٹر عابد حسین صاحب صالحہ عابد حسین صاحبہ، سردار جعفری صاحب اور راجندر سنگھ بیدی صاحب کے اعزاز میں منعقد کی گئی۔ جس میں بمبئی کی اہم ادبی شخصیتوں نے شرکت کی۔ جلسہ کی ابتدا میں جناب معین الدین حارث نے ڈاکٹر عابد حسین کا حاضرین جلسہ سے تعارف کرایا، اور بتایا کہ موصوف نے حال ہی میں ایک معرکتہ الآرا کتاب "ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں" لکھی ہے۔ جسے ملک کے پڑھے لکھے طبقہ میں بے حد پسند کیا گیا ہے۔ آگے چل کر حارث صاحب نے فرمایا کہ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس جلسے میں دو ایسے ادیبوں کو بھی دعوت دی گئی ہے جنھیں حال ہی میں معیاری انعامات سے نوازا گیا۔ اس میں سے ایک تو ہمارے ملک کے صف اول کے شاعر حضرت سردار جعفری صاحب ہیں جنھیں سوویت دیس کی طرف سے ان کے شعری مجموعے "ایک خواب اور" پر نہرو امن انعام ملا ہے۔ اور دوسرے ملک کے عظیم افسانہ نگار جناب راجندر سنگھ بیدی صاحب ہیں جنھیں ساہتیہ اکیڈمی کی طرف سے ان کے ناولٹ "ایک چادر میلی سی" پر پانچ ہزار کا انعام ملا ہے۔ میں ان دونوں ادیبوں کو مکتبہ جامعہ کی طرف سے آپ حضرات کی طرف سے اور اپنی طرف سے مبارکباد دیتا ہوں۔ حارث صاحب نے حاضرین جلسہ سے درخواست کی کہ جو صاحب چاہیں وہ ڈاکٹر عابد حسین صاحب سے ان کی کتاب کے سلسلے میں سوالات کرسکتے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی اور جناب حامد الانصاری غازی نے ڈاکٹر صاحب سے کچھ سوالات کیے جن کا جواب ڈاکٹر صاحب نے تفصیل سے دیا۔ وقت کافی ہوچکا تھا اس لیے انصار صاحب نے مختصر الفاظ میں راجندر سنگھ بیدی صاحب اور جعفری صاحب کا تعارف کرایا، اور ان دونوں ادیبوں سے درخواست کی کہ وہ خود بھی اپنے اپنے فن پر روشنی ڈالیں۔ سب سے پہلے راجندر سنگھ بیدی صاحب نے اپنے ناولٹ کے بارے میں بتایا کہ انھوں نے یہ ناولٹ کب اور کن حالات میں لکھا اور اس ناولٹ کا پس منظر پنجاب ہی کیوں چنا۔ بیدی صاحب کے بعد سردار جعفری صاحب نے تقریر سے گریز کرتے ہوئے اپنی دو نہایت خوبصورت نظمیں سنائیں ان میں سے ایک تاشقند معاہدے سے پہلے لکھی گئی تھی اور دوسری اس کے بعد حاضرین نے سردار جعفری صاحب کو دل کھول کر داد دی اس کے بعد حاضرین کی چائے وغیرہ سے تواضع کی گئی آخر میں مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ شاخ بمبئی کے منیجر جناب شاہد علی خاں صاحب نے مہمانان خصوصی اور دیگر مہمانوں کا شکریہ ادا کیا، اور تقریباً سات بجے یہ محفل بحسن وخوبی انجام پذیر ہوئی۔ (نامہ نگار)

عمیق حنفی کی طویل نظم سندباد کی اشاعت پر جلسۂ تہنیت

شعبۂ اردو و فارسی، اسلامیہ کریمیہ ڈگری کالج، اندور کی دعوت پر ۱۳ فروری ۱۹۶۶ء کی سہ پہر کو اندور کے شاعروں اور ادیبوں کے ایک جلسے میں عمیق حنفی کو ان کی طویل نظم سندباد کی اشاعت پر مبارکباد پیش کی گئی۔ جلسے کی صدارت کالج کے پرنسپل جناب ڈاکٹر انور علی صاحب نے فرمائی اور آغاز صدر شعبۂ اردو پروفیسر شمیم حنفی کی تقریر سے ہوا۔

شمیم صاحب نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے عمیق حنفی کو ان کی گرانقدر ادبی تخلیق کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرنے کے بعد یہ فرمایا کہ یہ نظم جسے ہندو پاک کے بہت سے معتبر ادیبوں نے سراہا ہے ہماری جدید شاعری میں ایک اہم اضافے اور ہماری ادبی تاریخ میں ایک کارنامے کی حیثیت رکھتی ہے۔ سندباد صحیح معنوں میں ایک طویل نظم ہے کیونکہ اس کا دائرہ انسان کی کائناتِ خیال کی طرح وسیع ہے۔ صنعتی زندگی کی حشر سامانی اور اضطراب سے پیدا شدہ المیے کو عمیق حنفی نے اس نظم کے ذریعہ جس فنکارانہ انداز میں واضح کیا ہے اس سے ہیئت کے ایک نئے اور کامیاب تجربے کی نشاندہی بھی ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج نت نئی سائنسی ایجادات و اختراعات نے مادی سکون کے ہزاروں سامان فراہم کردیے ہیں اس کے باوجود انسان کے وہ فطری تقاضے جو سکون و مسرت کی طلب سے عبارت ہیں صنعتی تہذیب کی بھول بھلیاں میں اپنی آسودگی و تکمیل کی خاطر سرگرداں نظر آتے ہیں۔ مشینوں کے شور اور مصنوعات کے ہنگاموں میں انسان اپنے آپ کو بھی کھو بیٹھا ہے کیونکہ اس کی فکری صلاحیتیں بھی اس انتشار اور گمرہی کی گرفت میں آچکی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خارجی اعتبار سے جیسے جیسے منازل ارتقا طے کرتا جارہا ہے اس کی اندرونی پیاس، روحانی کرب اور اپنے وجود کا نصب العین سمجھنے کی ازلی خواہش میں بھی اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ اپنی شخصیت کے کھوکھلے پن کے احساس نے اسے خود اپنی ہی نظروں میں مضحکہ خیز بنادیا ہے۔ سندباد میں عمیق حنفی نے اسی تاثر سے پیدا ہونے والے اضطراب و خلفشار کی عکاسی کی ہے۔

شمیم صاحب کی تقریر کے بعد عمیق حنفی نے اپنے میزبانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ چونکہ ادب میں ہونے والے تجربات سائنسی تجربوں کی طرح براہ راست ہماری زندگی پر اثر انداز نہیں ہوتے اس لیے ان سے مانوس ہونے میں بھی کچھ وقت لگتا ہے۔ سندباد کا ذکر کرتے ... انھوں نے یہ بھی کہا کہ آج مختلف خانوں میں بٹی ہوئی اور ثقافتی انتشار کے باعث بکھری

ہوئی شخصیت اگرچہ اپنی وحدت کے احساس سے محروم ہو چکی ہے لیکن اس المیے کے باوجود میں نے اپنی شاعری کو بے یقینی اور قنوطیت سے بچانے کی کوشش کی ہے کیونکہ میں نے زندگی کی قوتوں پر اپنے ایمان کو حتی الوسع کمزور نہیں ہونے دیا۔

چائے کے بعد شعراء نے اپنا کلام سنایا۔

جلسے کا اختتام صدر جلسہ جناب ڈاکٹر انور علی کی تقریر سے ہوا جس میں موصوف نے عتیق صاحب کو سندباد کی اشاعت پر مبارکباد دی۔

(۲۰ فروری ۱۹۶۶ء)

ایک ادبی نشست

نئی نسل کے شاعر کمار پاشی کے مجموعہ کلام "پرانے موسموں کی آواز" کے سلسلے میں ۱۳ر فروری کو ایک ادبی نشست ہندی بھون (نئی دہلی) میں منعقد ہوئی۔ صدارت کے فرائض جناب کوثر چاندپوری نے ادا کیے۔

اس نشست کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اردو شاعری کے اس مجموعے پر ہندی اور پنجابی کے ادیبوں نے تقریریں کیں اور اپنے ادب کی بنیاد پر کمار پاشی کی شاعری کو پرکھنے کی کوشش کی۔

سب سے پہلے جناب راج نرائن راز نے ایک مقالہ پڑھا جس میں جدید شاعری کے پس منظر اور کمار پاشی کے انفرادی اسلوب پر بھرپور روشنی ڈالی گئی۔ اس کے بعد پنجابی کے مشہور نقاد جناب شانتی دیو نے کمار پاشی کے فن کا جائزہ لیا، اور کچھ اعتراضات بھی پیش کیے۔ ان کے بعد محمود ہاشمی نے اپنی تقریر میں ان اعتراضات کا جواب دیا، اور اردو کی جدید شاعری نیز کمار پاشی کی شاعری پر بحث کی۔

شہاب جعفری نے اپنے مقالے میں کمار پاشی کے علامتی اسلوب اور ان کے منفرد استعاروں کے پس منظر پر انتہائی پرمغز نکات پیش کیے۔

کمار پاشی نے اپنے فن کے متعلق ایک مضمون پڑھا اور اپنی کچھ نظمیں سنائیں، جنھیں حاضرین نے بے حد پسند کیا۔ جناب کوثر چاندپوری نے اپنی تقریر میں نئی پرانی نسل، ان کے تضاد، ان کی روایت اور کمار پاشی کی شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

اس نشست کا اہتمام کوثر چاندپوری، راج نرائن راز اور ومیش گوڑ کی جانب سے کیا گیا تھا۔

(نامہ نگار)

اعلان

بسلسلہ خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں

تبصرے

شہریار

ماہنامہ "کتاب" سالنامہ ۱۹۶۶ء

زرِ سالانہ ۸ روپے
قیمت سالنامہ ایک روپے پچاس پیسے
ملنے کا پتہ: چوک، لکھنؤ ۳

ہندوستان سے شائع ہونے والے ادبی ماہناموں کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ ان میں سے بھی اکثر وقت پر شائع نہیں ہوتے یا مقامی خصوصیات کی وجہ سے ان کا حلقہ بہت محدود ہوتا ہے۔ "کتاب" اپنے معیار اور اشاعت کی پابندی کی وجہ سے مستثنیات کا درجہ رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں ہندوستان کے تمام اہم ادیبوں کی تخلیقات پابندی سے شائع ہوتی ہیں۔ عام رسائل کی طرح یہ صرف معتبر تحریروں اور مستند ادیبوں کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ اس میں ان مسائل پر بھی لکھا اور لکھوایا جاتا ہے جن کا تعلق ادب کے جدید ترین رجحانات اور نئی نسل کے "مشکوک" ادیبوں سے ہے۔ یعنی اس کے کارکنوں نے تعصب، تنگ نظری اور محدود ادبی وفاداریوں سے بچنے کی کوشش کی ہے اور اپنے رسالے کے ذریعہ ادب کے اس وسیع تصور کو عام کرنے کی کوشش کی ہے جس کا چلن آج بھی بہت کم ہے۔

زیرِ تبصرہ شمارے میں سب سے اہم چیز پروفیسر آل احمد سرور کا انٹرویو ہے جو خلیل الرحمٰن اعظمی نے لیا ہے۔ اس انٹرویو سے سرور صاحب کے ادبی نظریات اور فنی تصورات کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

عابد سہیل ایڈیٹر "کتاب" اور خلیل الرحمٰن اعظمی اس بھرپور انٹرویو کے لیے ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔

سرور صاحب کے انٹرویو کے علاوہ جو نثری تخلیقات ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں ان میں پروفیسر احتشام حسین، فراق گورکھپوری صاحب اور شمیم حنفی صاحب کے مضامین بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ خاص طور سے شمیم حنفی صاحب نے بعض ایسے مسائل کو اٹھایا ہے جن پر ہندوستان کے اردو والوں کو سنجیدگی سے سوچ بچار کرنا چاہیے۔ منظر سلیم صاحب نے سرور صاحب کی شخصیت کے بعض بہت دلکش اور قابل احترام پہلوؤں کی طرف بلیغ اشارے کیے ہیں۔

افسانوی حصے میں حیات اللہ انصاری، رام لعل، جیلانی بانو اور اقبال متین کی کہانیاں بار بار پڑھنے کے لائق ہیں۔ قاضی عبدالستار صاحب کے ناولٹ کی پہلی قسط شائع ہوئی ہے، اس کے بارے میں ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔

"نئی شاعری اور ایک نیا شاعر" کے عنوان سے جو دو مراسلے شائع ہوئے ہیں ان کا لب و لہجہ اور انداز کچھ غیر علمی ہو گیا ہے۔ ادبی بحثوں میں ایک سطح بہر حال ہونی چاہیے۔

شعری حصے میں محمد علوی، بانی، شہریار، شہاب جعفری، حلیم اللہ حالی اور ندا فاضلی کی نظمیں اور پروفیسر آل احمد سرور، خلیل الرحمٰن اعظمی، بشیر بدر، حسن کمال اور مظفر حنفی کی غزلیں ہر اعتبار سے اچھی تخلیقات ہیں۔ "نوک جھونک" کے عنوان سے جو طنز و مزاح کے ٹکڑے ہیں ان میں احمد جمال پاشا کا انشائیہ بہت خوبصورت ہے۔

مجموعی اعتبار سے "کتاب" کا یہ سالنامہ پڑھنے اور خریدنے کی چیز ہے۔

مالک انجمن ترقی اردو (ہند)، علی گڑھ، پرنٹر پبلشر اور ایڈیٹر نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر ... اردو ہند، علی گڑھ سے شائع کیا۔